کے رات کے کپڑے ویسے کے ویسے تہہ کیے پڑے تھے اور ان کے چپلوں کا جوڑا اسی جگہ پڑا تھا جہاں میں رکھ کر گیا تھا۔

میں پھر ڈرائنگ روم میں جا کر دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے آہٹ پا کر سر گھمایا اور میری طرف دیکھ کر بولے "لاہور کی سویر بڑی متورم ہے اور یہاں کے پنچھی بڑے سریلے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے حضور لیکن آپ نے یہ کیا کیا کہ ساری رات سوئے نہیں۔"

بولے "سویا بھائی سویا..... سویا کیوں نہیں۔ بس استھان بدلی نہیں کیا۔ یہ صوفہ بہت ہی آرام دہ تھا ماں کی طرح گود میں بٹھا کر بیٹھا رہا۔ جانے ہی نہیں دیا۔"

میں نے کہا "جناب آپ کو لمبے سفر پر جانا ہے کچھ تو خیال کیا ہوتا۔"

بولے "خیال کر کے ہی تو بیٹھا۔ خیال نہ کرتا تو اٹھ کر بچھونے پر چلا جاتا۔ پر یہ بچھونے سے زیادہ کرپالو تھا۔ سیوا میں ہی لگا رہا۔"

میں نے کہا "چلیے اب ناشتہ کر لیجیے۔"

کہنے لگے "ٹھیک ہے..... لیکن ان کا "ٹھیک ہے" کہنے کا انداز کچھ مختلف سا تھا۔ اگر اس کا پنجابی میں ترجمہ کیا جاتا تو یہ بنتا کہ "وہاں کہاں جاؤں گا۔ ایک پیالی ادھر ہی لے آؤ۔"

آہستگی سے اٹھے اور میرے ساتھ چلنے لگے۔

ناشتہ کرنے کے بعد جب وہ میری سے بیوی آگیا لے کر باہر نکلے تو وقت ذرا زیادہ ہو گیا تھا لیکن ان کی چستی کم تھی کہ ڈرائیور گاڑی لے کر پورچ میں کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

جب ہم رنجیت سنگھ کی مڑھی پر پہنچے تو بس تیار کھڑی تھی اور تقریباً سارے یاتری اس میں سوار ہو چکے تھے۔ بھائی باہلی کو کار سے اترتے دیکھ کر جتھے دار نے پکار کر کہا "گورو مہراج کی سنگتو! بس آپ ہی کی انتظاری تھی۔ آپ کا تھیلا بھائی بچن سنگھ کو دے دیا ہے اور وہ پرلی کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہے۔"

مرشد مجھ سے ہاتھ ملا کر کار سے باہر نکلنے لگے تو میں نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور ڈرائیور سے کہا "گل فراز! حسن ابدال چلو!"

اس نے میری طرف مڑ کر بہت اچھا صاحب کہا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ میں نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر جتھے دار سے کہا "آپ چلیں ہم آپ کے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔"

انہوں نے ذرا سختی سے کہا "یہ تم کیا کر رہے ہو شفائی۔ حسن ابدال تو بڑی دور ہے۔"

میں نے کہا "جی میرا دیکھا ہوا ہے۔ آپ پہلی مرتبہ جا رہے ہیں' اتنی دور نہیں ہے۔"

انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور شانت ہو کر بیٹھ گئے۔"

جب گاڑی راوی کے پل پر پہنچی تو انہوں نے دونوں طرف نظریں گھما کر دریا کو' دریا کے پانی کو اور کنارے لگی کشتیوں کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے "مجھے دریا سے بڑا عشق ہے۔ اس کی شکتی ماتا جیسی ہوتی ہے۔ ماں کا سا برتاؤ کرتا ہے۔"

"اور جب طغیانی میں ہو۔" میں نے پوچھا۔ "کناروں سے باہر نکل کر بستیوں کو سمیٹنے لگا ہو..... پھر؟"

کہنے لگے "پھر بھی ماں جیسا ہی ہوتا ہے۔ سوتیلی ماں کے انوسار۔ دکھ دیتا ہے' پر اپنا روپ نہیں چھوڑتا۔"

میں نے کہا "سرکار! پہلے تو آپ ایسے نہیں تھے۔ اب کچھ اور ہی طرح سوچنے لگے ہیں۔"

مسکرا کر بولے "ناپ بدلتا رہتا ہے۔ گھٹت بڑھت ہوتی رہتی ہے۔ کچھ مورکھ پرانے کپڑوں کے ناپ پر نئے سلوا لیتے ہیں لیکن دیہہ پر ٹھیک نہیں بیٹھتے..... جیسے باہر کا سریر ہے' ایسے ہی اندر کا بھی ایک سریر۔ دونوں میں اونچ نیچ' گھٹتی بڑھتی ہوتی رہتی ہے....."

پھر اچانک میری طرف رخ کر کے بولے "تم دریا پر آتے رہتے ہو؟"

میں نے کہا "وقت ہی نہیں ملتا سر! بڑی مشکل سے گھر جانا ہوتا ہے۔ اگر گھر والوں کا خوف نہ ہو تو بندہ گھر بھی نہ جا سکے۔"

کہنے لگے "بی بی کو بتا دینا کہ تم میرے ساتھ حسن ابدال چلے گئے ہو!"

میں نے کہا "وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے یہی فون کروں گا۔"

بولے "وہاں پہنچ کر نہیں' راستے میں کسی جگہ سے کر دینا۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے سر۔ گوجرانوالہ سے کر دوں گا۔"

پھر میں نے ان کا کندھا پیچھے دباتے ہوئے کہا "آپ سیٹ پر سر رکھ کر سو جائیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔"

انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سر پیچھے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے ساتھ میں نے بھی دونوں ہاتھ گود میں رکھے اور کھڑکی کی طرف جھک کر گہری نیند سو گیا۔

OCIETY.COM

۲۲

حسن ابدال پہنچ کر ہم نے سڑک کنارے شیشے والے ریستوران میں تلی ہوئی تازہ مچھلی کھائی۔ استاد مکرم گوشت کے ضمن میں صرف مچھلی کھا لیتے تھے' وہ بھی بہت تھوڑی۔ رک رک کر اور ٹٹول ٹٹول کر۔ ایک مرتبہ رجنی کو بتا رہے تھے کہ میں مچھلی کھا تو لیتا ہوں لیکن زیادہ نہیں۔ مجھے اچھی لگتی ہے اور لہسن کے ساتھ مل کر اس کی خوشبو اور بھی سواد شٹ ہو جاتی ہے لیکن میں ڈرتا رہتا ہوں۔

رجنی آنکھیں چمکا کر بولی "مچھلی سے ڈرتے ہیں کہ بھوگ سے!"

یہ سن کر ان کے چہرے پر پسینہ آ گیا اور وہ نظریں جھکا کر بولے "آج شاید مسالہ تیز ہے"

لیکن حسن ابدال کی مچھلی انہوں نے شوق سے کھائی اور ان کے چہرے پر کسی قسم کا پسینہ نہ آیا۔ وہ مسکراتے رہے اور چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے رہے۔

جب ہم کھانا کھا کر نکلے تو انہوں نے لجاجت سے کہا "اب جو تم ساتھ آ ہی گئے ہو تو کیمرے کی تلاش میں میری مدد کرو۔"

میں نے کہا "بالکل سرکار' بالکل...... میں آیا ہی اسی لیے ہوں۔ کیمرہ آپ کا آج ہی تلاش کریں گے بلکہ ابھی کریں گے اور اگر مل گیا تو یاتریوں کی بس آنے سے پہلے پہلے خرید لیں گے۔"

میری یہ بات سن کر ان کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم کو بڑی تکلیف دی ہے شفائی لیکن تمہارے سوا میرا کوئی اور ہے بھی نہیں۔"

میں نے جھپٹ کر ان کے ساتھ گھٹ کے جپھی ڈال لی اور میری آنکھیں نمناک ہو

گئیں۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں ان کے اس قدر قریب ہو سکا تھا۔ میری آرزو تو برسوں سے تھی لیکن مجھے ہمت نہیں پڑتی تھی۔

بازار میں دکانوں پر سمگلڈ چیزوں کی بھرمار تھی اور لوگ مقامی' مسافر' تاجر' سمگلر ان کو دیکھ بھال کر سودے کر رہے تھے۔ میں نے ایک دکاندار سے کیمرے کی بابت پوچھا تو اس نے مجھے دو کیمرے دکھائے۔ ایک بائیس روپے کا تھا اور دوسرا سو روپے کا۔

جب میں نے اس سے بڑھیا اور قیمتی قسم کے کیمروں کی بابت پوچھا تو اس نے کہا "تھا ایک لیکن کل بک گیا۔" "کہاں بک گیا؟" مرشد نے بے چینی سے پوچھا تو دکاندار نے ہنس کر کہا "گیانی جی کوئی اپنا نام پتہ تھوڑی بتا کر جاتا ہے۔ سودا آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور پھر ہماری طرز کی دکانداری کا سودا تو بالکل ہی نکل جاتا ہے' پوچھے بتائے بغیر۔"

میں نے کہا "اور کسی کے پاس ہو گا؟"

کہنے لگا "ایک دکان چھوڑ کر تیسری دکان سے پوچھئے۔ اس کے پاس پانچ آئے تھے' شاید کوئی پڑا ہو۔"

ہم جلدی سے تیسری دکان پر گئے تو اس نے گردن مروڑ کر کہا "پانچ آئے تھے' پانچوں کے پانچوں ایک دکاندار لے گیا۔"

"کہاں کا دکاندار؟" میں نے جلدی سے پوچھا تو اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"کہاں کا دکاندار؟" استاد مکرم نے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کر دور سڑک کی طرف دیکھا جیسے خریدار لاری اڈے پر کھڑا ہو اور پھر ہماری طرف دیکھے بغیر بولا "ساہیوال کا تھا اور صرف کیمرے خریدنے آیا تھا۔"

"لیکن تھے بڑھیا؟" میرے مرشد نے پوچھا۔

"نمبر ون" دکاندار نے ہمیں للچاتے ہوئے کہا "جرمن ماڈل۔ لائیکا نمبر III ساختہ روس۔"

"اور قیمت؟" میں نے پوچھا۔

"قیمت تو ہزار روپے فی دانہ تھی لیکن وہ آٹھ آٹھ سو کے اٹھا کر لے گیا۔ میں نے بہت زور لگایا' انکار کیا لیکن اس نے زبردستی پانچوں کے پانچوں تھیلے میں ڈال لیے اور چار ہزار کے نوٹ میرے سامنے پھینک کر چلا گیا۔"

OCIETY.COM

"ایک اور نہیں مل سکتا۔ ویسا" بھائی بالی صاحب نے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتے گیانی جی۔" دکاندار بولا "آنے کو تو آج درجن بھر آجائیں' نہ آئیں تو چھ مہینے گزر جائیں۔ یہ سمگلنگ کا مال ہے' مگر نہتی جی شریف گھرانے کی چور غیار جیسا۔ اس کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔"

میں دکاندار کی یہ بات سن کر چونکا اور اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس نے سر ہلا کر کہا "بابو صاحب سمگلنگ کے مال پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ خود ہی آتا ہے اور خود ہی چلا جاتا ہے۔ جیسے بہار پر آئی ہوئی شریف گھرانے کی لڑکی خود ہی اوھل جاتی ہے اور پھر خرچ خرچا کر خود ہی واپس آجاتی ہے۔ اس طرح سے ہمارا مال ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "جناب آپ کی بات ہے تو مزیدار لیکن ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی۔ شریف گھرانے کی لڑکی کیوں خاص طور پر؟"

کہنے لگا "کمین ذات کی لڑکیاں جب ایک مرتبہ اوھل جاتی ہیں تو پھر واپس نہیں آتیں۔ ان کو اوھلنے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ اس لیے خود جا کر ان کی بانہیں لانا پڑتی ہیں۔"

"اور شریف لڑکی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اونچے گھرانے کی اشرافیہ کا بچہ ہوتی ہے۔ اس کو جب اتنا کھیکھن کرنے کے بعد کوئی لطف نہیں آتا تو ایک شام خود ہی گھر واپس آجاتی ہے۔ ہمارا مال بھی نکل جاتا ہے اور گھوم پھر کر واپس بھی آجاتا ہے۔ اس کا نہ کوئی بیچک ہوتا ہے' نہ منڈی ہوتی ہے' نہ کیش میمو کٹتا ہے۔ جس طرح جاتا ہے' اسی طرح اسی صورت میں واپس آجاتا ہے۔ اغوا کرنے والے لڑکی کو چھپا چھپو کر لکو کر پردہ ڈال کر لے جاتے ہیں۔ اسی طرح سمگلنگ کا مال لے جانا پڑتا ہے۔ غیاروں کو تیز رفتار گھوڑیوں پر اوھال کر لے جاتے ہیں۔ سمگلنگ کے مال مرکھنی کھوتیوں پر لے جاتے ہیں جو پہاڑوں کی اوٹ میں اکیلی چلتی جاتی ہیں' بغیر کسی کھوتے وال کے' بغیر کسی رہنما' ہادی' پیر مرشد کے۔"

جب میرے مرشد نے مجھے اس چسکے دار گفتگو میں کانوں تک ڈوبتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے میرا کندھا ہلا کر کہا "ان سے پوچھو' کسی اور کے پاس سے مل جائے گا۔ یہاں دکان پر نہ ہو' گھر پر رکھا ہو۔"

دکاندار کہنے لگا "الیاس سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ اس کے پاس گھر پر بھی کچھ مال موجود رہتا ہے لیکن وہ پشاور گیا ہوا ہے اور بدھ وار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔"

"لیکن گیانی جی کو تو کل شام لاہور واپس چلے جانا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

دکاندار سوچ میں پڑ گیا۔

وہاں تین نوجوان کھڑے تھے جو بڑی دیر سے ہماری باتیں سن رہے تھے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ کسی حد تک ہمارا پیچھا کر رہے تھے اور کھسکتے کھسکتے ہمارے ساتھ ساتھ آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا "میرا نام طالوت خان ہے اور میں جمرود کا رہنے والا ہوں۔ پشاور یونیورسٹی سے ایم فل کر رہا ہوں اور یہ دونوں افغان مجاہدین ہیں۔ جلال یار اور ہاشم خان۔"

ہم دونوں نے ان کے ساتھ ہاتھ ملایا اور اپنے اپنے دست عقیدت سینوں پر رکھ کر ایک دوسرے کے سامنے ہلکا سا جھکے اور میں نے پہلی مرتبہ کلاشنکوف کو اس قدر قریب سے دیکھا۔

طالوت خان نے کہا "اگر آپ کو واقعی اچھے کیمرے کی ضرورت ہے تو پھر اچھا کیمرہ آپ کو پشاور سے ملے گا۔" میں نے اپنے استاد کی طرف دیکھ کر کہا "پشاور باڑہ سے سرکار۔"

"نہ نہ" جلال یار نے کہا "باڑے سے نہیں ادھر چھاؤنی میں ایک خاص دکان ہے۔ قیمتی مال کا ادھر سے ملے گا۔"

میں نے کہا "اب بھی ہو گا۔"

بولا "ضرور ہو گا۔ ابھی ہم نے پرسوں ادھر دیکھا تھا۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے استاد کی طرف دیکھا تو ان کو متردد اور متزلزل پایا۔

طالوت خان نے کہا "اگر آپ مجھے پشاور کا کرایہ دے دیں اور ساتھ سو روپے محنتانہ تو میں پشاور سے لا کر دے سکتا ہوں۔ ابھی چلا جاؤں گا اور صبح سویرے لے آؤں گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔"

لیکن جب میں نے اپنے گورو کی طرف دیکھا تو وہ گردن گھما کر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا "پھر یہ ٹھیک ہے ناں سر؟"

کہنے لگے "ٹھیک تو ہے پر وارا نہیں کھاتا۔"

"کیوں وارا نہیں کھاتا؟" میں اور طالوت خان ایک ساتھ بولے۔

"وہ اس لیے۔" انہوں نے سوچتے ہوئے کہا "وقت کم ہے' کھچل زیادہ ہے۔ ایسی کوئی خاص ضرورت کی بھی چیز نہیں..... رہنے ای دو۔"

OCIETY.COM

میں نے کہا "ان کے ساتھ میں چلا جاتا ہوں۔ گاڑی پر جائیں گے' ایسے ہی واپس آجائیں گے۔ پانچ چھے گھنٹے کی بات ہے' گئے اور آئے!"

کہنے لگے "نہیں' اندر نہیں مانتا..... اور جب اندر نہ مانے تو پھر کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ چل کر چائے پیتے ہیں اور سنگتوں کو بھی پلاتے ہیں....."

ان کے نہ نہ کہنے کے باوصف ہم ان کو سامنے چائے کے کھوکھے پر لے گئے اور پانچ پیالی پشاوری قہوے کا آرڈر بک کرا دیا۔

طالوت بار بار کہہ رہا تھا' سردار صاحب آپ کے شوق کی چیز ہے۔ پشاور اتنی دور بھی نہیں' مال بھی فریش آیا ہے.....

"بالکل فریش" جلال یار نے لقمہ دیا۔

"پھر آپ کیوں نہیں ہمیں لانے دیتے؟ بلکہ میں تو کہوں گا آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

میں نے نظریں گھما کر اپنے مرشد کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلا رہے تھے اور طالوت خان کے کندھے پر ہاتھ مار کر زبان حال سے کہہ رہے تھے "چھوڑو یار اجی۔ کوئی ضرورت نہیں۔ چھوٹی چھوٹی خواہش پر قابو نہ پایا تو بڑی خواہش کو کس طرح سنبھال سکیں گے۔ بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔"

ان کے طالوت خان کے کندھے پر ہاتھ مارنے سے میں کچھ جیلس سا ہو گیا۔ وہ بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور طالوت خان بھی تقریباً اسی انداز میں جواب دے رہا تھا۔ میں نے جھلا کر قدرے زور سے کہا "آپ کیوں نہیں چلتے سرکار۔ یہ تو پشاور ہے۔ اتنی دور آئے ہیں تو اپنی بچیوں سال کی پسند کو کیوں لے کر نہ جائیں۔ پھر یہ موقع بار بار کہاں ہاتھ آئے۔ چلئے اٹھیے' ہمت کیجئے۔"

انہوں نے میری کلائی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا "ایسی کونسی آکاشک سوغات ہے شفائی جس کے لیے جیون کمت کر دیں۔ پھر کبھی سہی..... اور پھر بھی کبھی نہ ہو سکا تو کوئی لالسا نہیں۔ لابھ نہیں۔ بس ایک کھیل تماشا ہی ہے ناں یہ کیمرہ۔ ہوا ہوا' نہ ہوا نہ ہوا۔ ایسی کونسی قیامت آئی جاتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ ایک دم کیسا فیصلہ ہو گیا؟"

مسکرا کر بولے "بس اندر بریک لگ گئی۔"

WWW.PAKS

جلال یار نے کہا "اگر تمہارا استاد ہے تو پھر اس کی خدمت کے لیے ضرور کوشش کرو۔"

"ناں ناں ناں۔ میرے استاد نے ہاتھ ہلا کر کہا "اب ضرورت نہیں رہی' سارا سین بدل گیا۔ دوسرا ڈرامہ چل پڑا۔"

"دوسرا کونسا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

ہنس کر بولے "کوئی اور..... مجھے کیا پتہ دوسرا کونسا!! ابھی تو ٹائٹل ہی آرہا ہے۔"

ہم سب ان کی اس بات سے لطف اندوز ہوئے۔ خاص طور پر افغان مجاہدین نے اسے بہت پسند کیا کہ وہ زبان کی دقت کے باوجود اس بات کی باریکی کو سمجھ گئے تھے۔"

جب ہم قہوہ پی چکے تو استاد مکرم نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا "تم اب چلو شفائی اور جب بھی لاہور پہنچو تو پہلے سیدھے اپنے دفتر جانا۔"

"خواہ دفتر بند ہو چکا ہو؟" میں نے شرارت سے کہا۔

فرمایا "بالکل..... اچاہے دفتر بند ہو چکا ہو۔"

میں نے کہا "ابھی آپ کے قافلے کو آنا ہے۔ کوٹھڑیوں کی الاٹمنٹ ہونی ہے۔ پھر آپ کو اکھنڈ پاٹھ میں شامل ہونا ہے۔ جب آپ پاٹھ میں شریک ہوں گے' اس وقت چلا جاؤں گا۔"

کہنے لگے "اتنا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لمبا سفر ہے۔ تم رات کے جاگے ہوئے بھی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "یہ حکم ہے؟"

بولے "ہاں حکم ہے!"

میں نے کہا "امر ہے؟"

بولے "بالکل امر ہے۔"

میں بادل ناخواستہ وہاں سے اٹھا۔ استاد مکرم کے نئے مہربانوں کو کڑی آنکھ سے دیکھا۔ اپنے اوپر لعنت اور نفرین کی اور شرمندگی ٹالنے کی غرض سے کہا "کل آپ کب تک پہنچ جائیں گے؟"

"لاہور!" مرشد نے لاہور پر زور دے کر پوچھا۔

میں نے کہا "جی۔"

OCIETY.COM

فرمانے لگے "کل شام تک ہی پہنچیں گے۔ مغرب کے بعد.....!"

میں نے کہا "میں آؤں گا۔"

بولے "ٹھیک ہے' آ جانا۔ پھر بیٹھیں گے۔"

پھر سب باری باری مجھ سے بغلگیر ہوئے اور مجھے یوں لگا جیسے طالوت خان' جلال یار اور ہاشم خان میرے بچپن کے بچھڑے ہوئے دوست تھے جو اتفاق سے حسن ابدال کے بازار میں مل گئے۔

WWW.PAKSO

۲۳

مغرب سے بہت پہلے میں رنجیت سنگھ کی مڑھی پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور کو آزاد کر کے اس سے گاڑی کی چابی لے لی اور بنچ پر بیٹھ کر استاد مکرم کا انتظار کرنے لگا۔

میرے استاد ماسٹر اقبال صاحب جنہوں نے بڑی محنت اور محبت کے ساتھ مجھے کلاسے روشناس کرایا تھا اور بڑی توجہ اور لگن سے کلارنٹ بجانا سکھایا تھا اور سر کے ایک مقام پر قائم کیا تھا اور جو بار بار انگلی اٹھا کر ایک ہی بات کہا کرتے تھے کہ سُر پکڑ کے رکھ۔ سُر کا مان مریادا نگہ میں رکھو۔ سُر کو اونچا استھان دو۔ وہی ماسٹر اقبال اب خود سر چھوڑ کر ایک دوسری لے میں داخل ہو چکے تھے۔

مجھے ان کا کڑا پہنا اور پرشاد چکھنا اچھا نہ لگا۔ وہ میرے صاحب تھے۔ میں ان سے شکوہ تو نہ کر سکتا تھا البتہ اندر ہی اندر آنسو ضرور بہا سکتا تھا۔ جب سے وہ یہاں آئے تھے اور جب سے میں نے ان کی وضع قطع دیکھی اور ان کی بولی بھاشا سنی تھی' میرا دل اور بھی بیٹھ گیا تھا۔ وہ پرانا تعلق تو قائم تھا مگر اندر سے کچھ دھاگے ٹوٹ گئے تھے۔ میرے اندر لاتعلقی کی ایک لہر سی پیدا ہونے لگی تھی۔ جیسے شفاف براق ٹھنڈے پانی کے گلاس میں زہر مہرہ رنگ کا ایک ذرہ گر جائے اور اس کی لہر آہستہ آہستہ سنپولیے کی طرح بل کھانے لگے۔

وہ مجھے پیارے بھی بہت تھے اور میری نظروں میں قیمتی بھی اسی طرح تھے مگر اس بیش بہا تار یخی مرتبان کی دراڑوں پر پیتل کے بہت سے گانٹھے لگ چکے تھے۔ دل کے اندر تھوڑی تھوڑی دیر کے ایک ہیپ بجتی اور اس ہیپ کے بعد ایک بے حد واضح جملہ مدھم آواز میں تین مرتبہ سنائی دیتا تھا۔ "کاش بھائی بابلی سکھڑا یہاں نہ آتا۔"

اس ہیپ کے آنے پر کبھی میں دائیں دیکھتا' کبھی بائیں' کبھی سر اوپر اٹھا کر درختوں کی

OCIETY.COM

ڈالیوں میں اپنا دھیان پھنساتا لیکن ریکارڈ فقرہ ٹھاکر کے اپنے مقام پر آ جاتا۔

بنچ سے اٹھ کر میں روش پر ٹہلنے لگا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک۔ گھسی پٹی' پھٹی اور سوکھی ہوئی گھاس پر۔ پرانے لفافوں' پتوں اور چیتھڑوں پر چلتے ہوئے مجھے طے شدہ مسافت پر آتے اور جاتے ہوئے مجھے یہ چیزیں بار بار ملتیں اور میں ان کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی پہچان جاتا کہ اب میں کس مقام پر ہوں۔

یاتریوں کی بس کے آنے' رکنے' دروازے کھلنے اور سنگتوں کے اترنے کے شور نے مجھے جلدی سے بس کے سامنے لا کھڑا کیا اور میں سب کچھ بھول بھال کر استاد مکرم کے اترنے کا انتظار کرنے لگا۔ مرد' عورتیں آہستہ آہستہ اتر رہے تھے کیونکہ ان کے ہاتھوں میں حسن ابدال کی سوغاتیں' اکھنڈ پاٹھ کی شیرینی کے لفافے اور پاؤں میں سونے کی بوجھل کیفیت تھی۔ سب لوگ سوچ سوچ کر اور رک رک کر اتر رہے تھے۔

میرے دل کی ہیپ اب بند ہو گئی تھی۔ میں نے ایڑیاں اٹھا کر دو تین مرتبہ اس محبوب صورت کو دیکھا جس کے انتظار میں کب سے اس جگہ بیٹھا تھا لیکن میری ایڑیاں اٹھانا میرے کچھ کام نہ آیا کہ استاد مکرم کی شکل اترتی ہوئی سواریوں میں نظر نہ آئی۔

جب بس بالکل خالی ہو گئی اور وہ نظر نہ آئے تو میں نے پریشانی کے عالم میں ایک بڑی عمر کی عورت سے پوچھا "بی بی بھائی باہلی نہیں آئے؟"

اس نے چہرہ میری طرف گھمائے بغیر کہا "وہ تو چڑھے ہی نہیں۔ ہم ان کی بھال کرتے ادھا گھنٹہ ہارن بجاتے رہے۔"

میں نے اس بی بی کو چھوڑ کر ایک پڑھے لکھے معزز سکھ سے پوچھا۔ "گیانی بھائی باہلی نہیں آئے آپ کے ساتھ؟"

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر مجھے پہچانتے ہوئے بولا "وہ تو بس پر چڑھے ہی نہیں۔ ہم ہارن بجاتے رہے۔ لوگ ان کی کھوج کرتے رہے مگر وہ نظر ہی نہیں آئے۔ ہم نے پکا اندازہ لگا لیا کہ وہ آپ کے ساتھ چلے گئے ہوں گے۔"

پھر اس نے مزید غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ انہیں اپنی کار میں لے کر نہیں گئے تھے؟" میں نے کہا "ضرور لے کر گیا تھا۔"

"پھر آپ ان کے ساتھ بازار میں بھی گھومتے رہے تھے' انیک دکانوں پر۔"

"جی ٹھیک ہے۔"

WWW.PAK

"جب آپ قہوہ پی رہے تھے کھوکھے پر' اس وقت میں نے آپ کو دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"اس وقت آپ کے ساتھ کچھ افغانی پٹھان بھی تھے۔"

میں نے کہا "یہ بھی ٹھیک ہے۔"

تو پھر ہم نے تو یہی سمجھا کہ گورو کے پیارے جیسے اکٹھے کار میں آئے تھے' ویسے ہی واپس چلے گئے ہوں گے۔"

میں نے ہڑبڑا کر کہا "وہ میرے ساتھ تو نہیں آئے۔ میں تو اکیلا ہی آگیا تھا۔"

سکھ سردار نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پریشانی کے عالم میں بولا "پھر تو بڑی مشکل ہو گی۔ کل صبح ہمیں جانا ہے۔ گنتی پوری نہ ہوئی تو خرابی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "وہ اکھنڈ پاٹھ میں شریک نہیں ہوئے؟"

"ہوئے۔" سکھ سردار نے کہا "ہوئے کیوں نہیں..... شروع میں کمال کا بھاشن دیا۔ پھر سماپتی سرلاپدیش بھی دیا۔ اس کے بعد نظر نہیں آئے۔"

"کسی کو کچھ بتا کر بھی نہیں گئے؟" میں نے پوچھا۔

"ناں۔" سردار نے منہ سے نہ کا چٹاخے دار صوتی تاثر نکال کر کہا "کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں۔"

میری خاموشی اور پریشانی بھانپ کر وہ سکھ سردار کہنے لگا "میں نے ان کو انہی پٹھانوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھتے دیکھا تھا جن کے ساتھ آپ قہوہ پی رہے تھے۔"

"اوھو!" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "وہ پشاور چلے گئے ہوں گے کیمرہ خریدنے۔"

سردار نے میری طرف ایسی حیرانی سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو "انہیں پشاور جانے اور کیمرہ خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو دھارمک آدمی ہیں۔ ان کا فوٹو گرافی سے کام؟"

میں نے کہا "اب وہ رات کو سیدھے پشاور سے آئیں گے اور صبح آپ کے ساتھ باڈر کراس کر جائیں گے۔"

"کر جائیں بائی کر جائیں۔" سکھ سردار نے رک رک کر کہا "کہیں سب کو یب نہ ڈال دیں بگانے دیس میں۔"

OCIETY.COM

میں نے ان کا کندھا تھپتھپا کر کہا" نہیں سردار جی نہیں۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ وہ پشاور چلے گئے ہیں اور آدھی رات سے پہلے واپس آجائیں گے۔ اس وقت وہ اٹک کا پل کراس کر چکے ہوں گے۔"

سردار بابا کی تسلی کرنے کے بعد میں گاڑی میں بیٹھا اور گھر واپس آگیا۔ ان کو الوداع کہنے کی اور بھول چوک کی معافی مانگنے کی بڑی خواہش تھی لیکن ان کی روانگی کا کوئی علم نہ تھا۔ ان سے ملاقات ہو جاتی تو سارا پروگرام آسانی سے طے کر لیتا۔

WWW.PAKS

۲۴

دن کے بارہ بجے جب میں دفتر میں اپنے عملے کے ساتھ ہفت زبانی لغت کے کارڈ تیار کر رہا تھا تو ایک لحیم شحیم تھانیدار دو باوردی سپاہیوں کے ساتھ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کافی اونچی آواز میں بولا "مسمی بھائی اقبال سنگھ المعروف بابلی گرنتھی کہاں ہے؟"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ میرے عملے کے دوسرے لوگ بھی سروقد اٹھ کھڑے ہوئے ہیں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف رکھئے۔ بھائی بابلی گرنتھی صاحب کا اتہ پتہ مجھے معلوم نہیں۔ میں ان سے ملا ضرور ہوں....."

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری بات کاٹ کر کہا "آپ کل انہیں اپنے ساتھ اپنی سرکاری موٹر میں لے کر حسن ابدال نہیں گئے تھے؟"

میں نے کہا "ضرور گئے تھے اور میری خواہش تھی کہ جس طرح ان کو ساتھ لے کر گیا تھا اسی طرح واپس لے کر بھی آتا لیکن انہوں نے مجھے یہ کہہ کر واپس پھیر دیا کہ اب میں خود آجاؤں گا۔ تم جاؤ" "لیکن وہ واپس نہیں آئے۔" تھانیدار نے کہا "اور جتھہ ان کے بغیر واپس انڈیا گیا ہے۔ تین گھنٹے تک اس کی تھاروچیکنگ ہوتی رہی اور ایک ایک یاتری سے پوچھ گچھ کی گئی..... وہ اب کہاں ہے؟"

میں نے کہا "مجھے ان کے محل تقرر ہی یا حدود موجودہ کا کوئی علم نہیں۔" میں ان کو چھوڑ کر واپس آگیا تھا!

تھانیدار نے کہا "ان کے ساتھ تین پٹھان کون تھے؟"

میں نے کہا "وہ ہم کو اچانک مل گئے تھے اور ہم انہیں جانتے نہیں تھے..... لیکن ان کے ساتھ ہماری کوئی بھی ملاقات نہیں تھی۔ انہوں نے قہوے کی دعوت دی تھی جو ہم

OCIETY.COM

نے بڑے شوق اور خلوص کے ساتھ قبول کرلی تھی۔ اس کے علاوہ ہم ان کے ساتھ کہیں نہیں گئے۔"

تھانیدار نے کہا "ہماری اطلاع کے مطابق مسمی اقبال سنگھ بابلی گرنتھی انہی کے ساتھ انہی کی جیپ میں پشاور کی طرف گیا ہے اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں۔"

میں نے کہا "ضرور گئے ہوں گے کیونکہ ایک کیمرے کی ضرورت تھی اور وہ کیمرہ ان کو پشاور کے بازے سے ہی مل سکتا تھا۔"

"لیکن اس کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ سوائے دو شہروں کے پاکستان کے کسی اور شہر میں نہیں جاسکتا تھا۔" "یہ ان کو یقیناً معلوم تھا" میں نے جواب دیا "لیکن انہوں نے سوچا ہوگا کہ چند گھنٹوں کے لیے کسی دوسرے شہر ہو آنا کچھ ایسی خطرناک بات نہ ہوگی اس لیے ان کے ساتھ چلے گئے۔

"وہ کہاں کے پٹھان تھے" تھانیدار نے پوچھا "پاکستانی پٹھان یا افغانی"

میں نے کہا "میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ ان کے لہجے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ افغانی ہیں لیکن ان میں سے ایک پشاور یونیورسٹی کا طالب علم بھی تھا۔"

"کچھ پتہ نہیں چلتا اور کوئی بس نہیں چلتا" تھانیدار نے زچ ہو کر کہا "سب گڈمڈ گیا اور ہر کوئی گھسڑم گھسیڑ ہو گیا۔ اس روسی جنگ نے تو آدھا افغانستان ہماری طرف دھکیل دیا۔"

میں نے کہا "وہ تو آپ کے سامنے ہے اور اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ جنگوں میں اس طرح کے واقعات تو ہوا ہی کرتے ہیں۔"

تھانیدار نے اٹھتے ہوئے ماں کی ایک گندی سی گالی دی جس کو ہم سب نے اپنے اپنے لیے سمجھا اور اپنے اپنے لئے جانا حالانکہ اس نے یہ گالی اپنے آپ کو مخاطب کر کے دی تھی۔ پھر اس نے میری طرف منہ کر کے کہا "وہ تو چلا گیا مائی کا یار سکھوا گرنتھی! لیکن ہم کو ہاتھی کے چیو کے ساتھ بندھوا گیا اب میں کہاں سے اس کی گنتی پوری کروں۔"

میں نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ وہ ذمہ دار آدمی ہیں۔ جونہی کیمرہ مل گیا وہ خود ہی آجائیں گے۔"

اس نے ایک گالی کیمرے کو ایک اپنے آپ کو ایک گرنتھی کو اور ایک ذرا سی پہلو کے

بل کر کے مجھے دی اور سپاہیوں کی طرف منہ کر کے بولا "اوئے بہن کے یار واب تم بھی منہ اٹھا کر کھڑے ہو گئے ہو' چلو آگے لگو۔"

دونوں سپاہی ایڑی سی کھڑکا اس کے آگے لگ گئے اور وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میرے عملے نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ تھانیدار ان میں سے کسی سے بھی مخاطب نہیں تھا۔

مجھے انڈیا سے تقریباً ایک جیسی عبارت کے دو خط آئے جن میں بڑی لجاجت اور گہرے دکھ کے ساتھ بھائی بالی کے بارے میں پوچھا گیا تھا کہ میں نے انہیں کیوں چھپالیا اور کہاں چھپالیا اور اب ان کی رہائی کی کونسی تاریخ مقرر ہوئی ہے۔

یہ دونوں خط رجنی کے معلوم ہوتے تھے کیونکہ وہ ہر و کو دو چشمی لکھا کرتی تھی اور اس کی ہر سطر دائیں سے بائیں کو جاتے ہوئے آخر میں نیچے کو جھکتی جاتی تھی۔ گو اب اس کی اردو بہت کمزور ہو گئی تھی اور اس کے ہجے جابجا غلطی کرتے تھے لیکن اس کے اندر کا دکھ بہت بڑھ گیا تھا اور وہ درد کی آخری منزل میں نظر آتی تھی۔ اگر اس نے مجھے اپنا پتہ لکھا ہوتا یا ہمارا کوئی رازداں اس قصبے میں موجود ہوتا تو میں ہر حال میں اس کو جواب لکھتا اور دبلے پتلے گرنتھی کا حال بتا کر اس کی تشفی کرتا لیکن اب تو کوئی صورت ہی نہیں تھی۔

ادھر ہر ہفتے دس دن بعد تھانیدار صاحب ایک رجسٹر اور چند فائلیں لے کر میرے پاس آجاتے اور نئے سرے سے تفتیش شروع کر دیتے۔ میں نے ان کی اس آمد و رفت کا ذکر ایس پی سے بھی کیا لیکن انہوں نے ہنس کر ٹال دیا اور یہ رائے دی کہ تھانیدار صاحب کو ایک پیالی چائے اور قریبی کسی دکان سے آدھ پاؤ مٹھائی منگوا کر دے دی جائے تو وہ کارروائی ڈال کر جلد اٹھ جایا کریں گے۔ میں نے ایس پی صاحب کو بتایا کہ چائے تو ہمارے دفتر میں کمال کی بنتی ہے البتہ ہمارے قریب مٹھائی کی کوئی دکان نہیں ہے۔ انہوں نے کہا "تازہ مٹھائی کی چنداں ضرورت نہیں۔ کسی قریبی کھوکھے کے ٹین کنستر میں پڑی پرانی مٹھائی بھی آسانی سے چل جائے گی..... خدا ایس پی صاحب کا بھلا کرے۔ انہوں نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب تھانیدار صاحب آتے تھے تو انہیں میرا پی۔ اے اور اکاؤنٹس آفیسر خود بھی سنبھال لیتے تھے مجھے ملنا نہیں پڑتا تھا۔

OCIETY.COM

۲۵

اس واقعے کو پورا ایک سال گزر گیا اور یہ عجیب بات ہے کہ میں نے اپنے استاد کی یاد میں کلارنٹ کا ریاض باقاعدگی سے شروع کر دیا۔ رات کے پچھلے پہر اپنی کوٹھی کے ایک متروک چوبارے میں پرانے کاٹھ کباڑ اور گودڑ پھونس کے اندر جب میں سٹول پر اکڑوں بیٹھ کر آسا کی وار شروع کرتا تو میرے اندر درد کی لہریں اٹھ اٹھ کر لے کی سنگت کرتیں اور میری محنت کی اٹھائی ہوئی ایگو کی چار دیواری کسی کسی لمحے پوری کی پوری ڈیہہ کر فلیٹ ہو جاتی۔ گہری لذت کے اس وجد انگیز لمحے میں ساری کائنات میرے ساتھ اک مک ہو جاتی اور میں جھکا سا کھا کر ماؤتھ پیس پرے کر کے اونچی آواز میں کہتا Oh! I Love you.I Love you لیکن یہ لمحہ اس قدر مختصر ہوتا کہ میں پورا فقرہ بھی ادا نہ کر سکتا پھر مرگی کے جھٹکے سے نکلتے اور میں نسل ہو کر بیٹھ جاتا۔ اذانوں کی آوازیں آتیں' چھوٹے چھوٹے پرندے گراری دار بولی کا لوپ چلا دیتے۔ پو پھٹتی اور مجھے کوٹھڑی میں اپنے وجود کا احساس ہونے لگتا۔ کلارنٹ کے جوڑ کھلتے۔ رومال سے پونچھے جاتے۔ ڈبے میں بند ہوتے اور ڈبہ وہیں ایک طاقچے میں رکھ دیا جاتا۔

پورے ایک سال بعد جب شہیدی گورو ارجن دیو پر سکھ یاتری انڈیا اور افغانستان سے گوردوارہ ڈیرہ صاحب آئے تو ایک سکھ اور ایک سکھنی مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے گھر پہنچ گئے۔ ان کے چہرے پر تکدر کے آثار تھے اور وہ بے حد تھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

سردار گوردیال سنگھ نے کہا "میں ریٹائرڈ مجسٹریٹ درجہ اول ہوں اور جالندھر سے آیا ہوں۔ یہ میری دوسری بیوی ہیں اور آپ کے مالوے کی ہیں۔"

میں دوسری بیوی پر چونکا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر فتح بلائی اور ہنس کر کہنے لگی ان کی پہلی بیوی فوت ہو گئی تھی۔ بچہ بچی کوئی تھا نہیں۔ ان کو بڑی تکلیف تھی تو انہوں نے میرے سے

شادی کرلی۔ میں کنیا مہادیالا کی گریجویٹ ہوں اور میں نے فیروزپور کے مشاعروں میں آپ کو لیڈی ہملٹن کا نسواری کرتہ پہنے کئی بار دیکھا ہے۔

مجسٹریٹ صاحب نے ذرا سے ترش لہجے میں کہا "اوہ میں نے دوسری بیوی اس لیے کہا تھا کہ میری اور تمہاری عمر کا فرق واضح ہو جائے تم نسواری کرتہ لے کر بیٹھ گئی ہو۔"

اس نے خوش ہو کر کہا "یہ پہنتے جوتے' اس لیے کہہ رہی ہوں۔ یہ درمیان میں دسوندھا نکالا کرتے تھے۔

سردار جی نے کاکا کر کہا "اوئے جو کیس نہیں رکھے گا وہ دسوندھا ہی نکالے گا اور اسے کیا کرنا ہے؟ پھر انہوں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا "معاف کیجئے گا ہم اجازت لئے بنا آ گئے لیکن ہم مجبور تھے۔ ہمیں گرنتھی بھائی باہلی کی تلاش ہے۔ میں نے تو خیر ان کو دیکھا نہیں لیکن میرے سسرال والے سب ان کے عاشق ہیں....."

ان کی بیوی نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا "اور میں سب سے زیادہ۔ ہم ہر دوسرے مہینے ان کا ارداس سننے تخت پور جایا کرتے تھے۔ سارا خاندان' چھوٹے بڑے' مرد عورتیں سب..... مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے"

"اوئے یہ گرنتھی لوگ ساری جمیوں سے اسی طرح کا پیار کرتے ہیں" مجسٹریٹ صاحب نے کہا "لیکن ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ مُلا' پنڈت' گیانی گرنتھی سب ایک ہی تھیلی کے مٹکے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "دھن بھاگ جو آپ میرے یہاں تشریف لائے اور میرا مان بڑھایا لیکن بھائی باہلی صاحب کے سلسلے میں بھی آپ ہی کی طرح بے خبر ہوں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ ہارڈر کراس کر گئے ہیں لیکن جھتے کے ساتھ نہیں اس کے بعد۔"

"پنجاب میں تو جتنے گوردوارے ہیں وہاں تو موجود نہیں۔" بیگم مجسٹریٹ نے کہا "کہیں اور چلے گئے ہوں تو کچھ کہہ نہیں سکتے۔ میرے چھوٹا چاچا جی نونہال سنگھ نے کہا تھا کہ آپ سے ان کا پتہ چل سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اصولی طور پر تو مجھی سے چلنا چاہیے لیکن میں بھی رہ گیا ہوں۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے بھائی باہلی صاحب کو ترنتارن میں دیکھا تھا۔"

"یہی بات کہیں سے میرے سوہرے کو بھی معلوم ہوئی" مجسٹریٹ صاحب نے کہا "اور تین دن لگا کر وہ ترنتارن کی گلی گلی اور گھر گھر جھانک آئے پر ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

OCIETY.COM

ہوتے تو پتہ چلتا ناں۔"

مجسٹریٹ کی بیوی نے کہا "کچھ لوگ کہتے ہیں وہ کناڈا چلے گئے ہیں اور کئی سکھوں نے ان کو ٹورانٹو کے بڑے گوردوارے میں پاٹھ کرتے بھی دیکھا ہے......"

میں نے کہا "سنا تو میں نے بھی تھا لیکن میرا دل نہیں مانتا۔"

"میرا دل بھی نہیں مانتا" مجسٹریٹ صاحب نے کہا "پر ان کو چٹھی ضرور لکھنی چاہیے تھی آپ کے نام۔ آخر آپ کا پرانا جنم مرن کا ساتھ ہے گورو چیلے کا!"

میں نے کہا "آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں۔ میرا ان کا ایسا ہی ساتھ تھا لیکن گورو جب ایک مرتبہ روٹھ جائے تو پھر مشکل ہی سے منتا ہے۔"

"ناں ناں۔ ویر جی ناں" بیگم مجسٹریٹ نے انگلی اٹھا کر کہا "گورو کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ چیلے کو ستیہ داری رکھنے کے لیے دکھاوے کے طور پر ناراض ہو جاتا ہے۔ اندر سے اس کے ساتھ رہتا ہے' سوادھان ہوشیار اور چوکس ہو کر۔"

"تجھے کیسے معلوم ہے؟" مجسٹریٹ صاحب نے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے ناں" بیوی نے چترائی کیساتھ شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا "پھر بھائی بابا جی صاحب کی تو مجھے ہر ادر کی دشا معلوم ہے!"

"کیوں تو ان کے ساتھ کھیلتی رہی ہے" مجسٹریٹ نے جھلا کر کہا۔

"کھیلتی تو نہیں رہی' بیوی نے شرمندگی سے کہا" پر ان کی اسرتی میں دیا ضرور جلا کر رکھتی رہی ہوں۔ وہ پوجیہ گرنتھی ایک اکیلے تھے جن پر ساری سرشٹی قربان کی جا سکتی ہے...... میرا دل کہتا ہے وہ ایک دن اچانک آئیں گے اور سب کو درشن دیں گے۔

"کیوں؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

"اس لیے کہ: رام جھروکے بیٹھ کے سب کا مجرا لے
جیسی جا کی چاکری ویسا اس کو دے......" یہ دوہا پڑھ کر مجسٹریٹ کی بیوی رک گئی کہ اس نے لاتعلق سی بات کر دی ہے اور موقع محل کے مطابق شعر نہیں پڑھا۔ لیکن مجسٹریٹ کو اس کا بالکل احساس نہیں ہوا اور وہ اسی طرح سے چائے میں چینی گھول گھول کر پیتا رہا۔

رخصت ہوتے وقت انہوں نے کہا "ہم تو بڑی آس لے کر آئے تھے لیکن آپ کے یہاں سے بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اگر کچھ معلوم ہو جائے اور ان کی کوئی اگھ سگھ مل جائے تو ہم کو اس پتہ پر اطلاع کر دینا۔"

WWW.PAKS

مجسٹریٹ صاحب کا وزٹنگ کارڈ پڑھتے ہوئے میں نے بھی ان سے درخواست کی
اگر ان کو میرے ست گورو کا کوئی نیاس نشان مل جائے تو وہ مجھے بھی چیتاونی دے دیں کیو
ان کے بغیر میری زندگی آدھی ہو چکی ہے۔"

مجسٹریٹ صاحب کی بیوی نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے کو لگاتے ہوئے کہا "ان کے بغ
بہت سے بندوں کی زندگیاں ونر تھ ہو چکی ہیں۔ اب تو بس ایسے ہی زندگانی رہ گئی ہے۔
دھرم اور ناستک!"

مجسٹریٹ صاحب نے کہا "چلو چلو۔ جلدی کرو' ان کو کوئی کام ہو گا..... ایک تو
اطلاع کئے بغیر آ گئے دوسرے تم نے اپنی رام کتھا شروع کر دی۔"

بی بی نے گردن موڑ کر فتح بلائی اور میں ان کو پھاٹک تک چھوڑنے گیا تو ان کا ٹیک
ڈرائیور نیم تلے بیٹھا چھوہارے کھا رہا تھا۔

OCIETY.COM